Ghulam Rabbani
Lecturer, Govt. Gradute College, Joharabad

غلام ربانی
لیکچرار، گورنمنٹ گریجویٹ کالج جوہر آباد

انیس ناگی کے ناولوں میں بیگانگی

Alienation in Anees Nagy's Novels

Abstract: The alienation that modern man is concerned about is related to human psychology. Man has become disconnected at the internal and external level, the sense of life has become meaningless for him. Many writers have made alienation the subject of their writings. He created and explained what alienation itself is. Anees Nagi is the top among the writers who felt loneliness in the true sense. Alienation is reflected in his novels. Most of his characters are in a state of mistrust, fear and uncertainty. Apart from being indifferent to himself, he is also alienated from his surroundings. In this paper, the existential pain and alienation of modern man is made the subject in the novels of Anis Nagy. Various characters in his novels seem to suffer from mistrust, fear, uncertainty and loneliness. Nagy's characters shows a sense of meaninglessness and detachment from the environment. In the form of social inequalities, dualism and religious monopolies, his characters seem alienated from themselves and society

KeyWords: human psychology, mistrust, inequalities, dualism, monopolies

بیگانگی کی اصطلاح بہت سے علوم میں رائج ہے۔ سماجی اور معاشرتی نظریات، فلسفے اور نفسیات میں اس کا ذکر ہوتا رہا ہے اس کے علاوہ عام سیاق وسباق میں بھی اسے بالحاظ اور بلالحاظ برتا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بیگانگی اور اجنبیت مغرب کا خاصہ تھی اور مغرب جو صنعتی انقلاب کے بعد اپنی اصل سے دور ہوتا چلا گیا۔ گھرانے ٹوٹے اور فرد معاشرے سے کٹ کر رہ گیا تو وہاں کے ادیب نے اس چیز کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ روسو نے بہت عرصہ پہلے معاہدہ عمرانی میں اس بات کو کسی اور تناظر میں موضوع بنایا کہ انسان اپنی فطری زندگی سے دور ہو گیا ہے جو اس کی زندگی کا بنیادی مرحلہ تھا اس میں انسان فطری زندگی گزار رہا تھا۔ خیر اس عہد کی تجدید کے لیے اس نے عمرانی معاہدے کو حل بتایا مگر بعد میں بہت سے ادیبوں نے بیگانگی کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا اور بذات خود بیگانگی کیا ہے اس کی وضاحت کی۔ مگر مشرق جس کی اقدار میں خاندانی نظام ایک بنیادی اکائی تھی اور مشرق اپنے ماضی سے اور اپنی روایت سے جڑا ہوا تھا اور اسی روایت کے ذریعے ہی مشرق کو دریافت کیا جاتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مشرق اور مغرب کے فاصلے ختم ہوتے چلے گئے اور دنیا میں ہونے والے تمام واقعات تمام جگہ مؤثر ہونے لگے یہ گلو بلا ئزیشن کی وجہ سے یا دوسرے کئی عوامل ہو سکتے ہیں جن کی بحث ہمارا موضوع نہیں ہے۔

مشرق پر مغرب کی یلغار فقط معاشی ہی نہیں تھی بلکہ یہ کسی حد تک ثقافتی سطح پر بھی اثر انداز ہوئی۔مشرق میں وہی اثرات بعد میں محسوس ہونے لگے جو مغرب کچھ عرصہ پہلے سے محسوس کر رہا تھا۔ایک وقت تھا جب بیگانگی کا ذکر آتا تو اس میں مغرب کا خیال آتا اور مشرق میں یہ برآمدی چیز سمجھی جاتی تھی مگر وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ بیگانگی مغرب ہی میں نہیں بلکہ مشرق کی رگوں میں بھی وائرس بن کر پھیل چکی ہے۔مشرق اپنے اصل سے کٹتا چلا گیا۔اسکا پرانی اقدار سے اعتماد اُٹھ گیا یا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ روایت میں اتنا دم نہیں رہا کہ وہ آنے والے دور کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔خاص طور پر بڑے شہروں میں زندگی اور ضروریات زندگی نے فرد کو تنہا کر دیا دو بڑے واقعات یعنی ایک جنگ آزادی جس میں پاکستان اور ہندوستان دو الگ ملکوں کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرے۔وہیں پر فرد نے بھی خود کو دو حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔اپنے ثقافتی ورثے سے علیحدگی نے فرد کو اپنی اصل سے کاٹنے میں اہم کردار ادا کیا تو دوسری طرف ۱۹۷۱ء میں پاکستان اور بنگلہ دیش کی علیحدگی نے فرد کا بچا کھچا اعتماد بھی کھودیا:

> "جس بیگانگی سے ہم جدید ادب میں دوچار ہوتے ہیں اس کی جڑیں انسانی نفسیات میں پیوست ہیں۔آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنے عمیق ترین جذبات اور ضروریات سے کوئی ربط باقی نہیں رہا اور اس معاشرے پر اثرانداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتا جس کا حصہ ہے۔زندگی کو سلیقے سے گزارنے یا بامعنی عقائد یا اقدار اپنانے کے رہنما اصول بھی اسے کہیں سے نہیں ملتے۔"(۱)

جن ادیبوں نے فرد کی اس تنہائی کو صحیح معنوں میں محسوس کیا انیس ناگی اُن میں سر فہرست ہیں۔انیس ناگی کی تحریروں میں جابجا فرد کی یہ بے گانگی جھلکتی نظر آتی ہے۔ان کے ناولوں کے جتنے بھی کردار ہیں ان میں ایک قدر مشترک ہے کہ اکثر و بیشتر کردار اپنی سوسائٹی سے کٹے ہوئے ہیں گھر کی زندگی میں بد اعتمادی اور خوف کا شکار ہیں، دفتر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی سازشوں سے ڈرے ہوئے ہیں اپنے مستقبل کے بارے میں غیر یقینی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔مذہب کے بارے میں ان کے اندر تیقن کی قوت ختم ہو چکی ہے۔ایمان داری انسانیت، بھلائی اور ہمدردی جیسے جذبات کے نتائج توقع کے برعکس منفی صورت میں برآمد ہوتے ہیں۔"قلعہ" کا دارا اپنی تمام تر ایمانداریوں کے باوجود عتاب کا شکار ہوتا ہے اس کے ساتھ آخر پر یہ سلوک ہوتا ہے کہ ایمانداری کے نتیجے میں اس کی نوکری ختم ہو جاتی ہے۔آرتھر ، دارا اور ڈاکٹر ظفر کے درمیان ہونے والے مکالمے بیگانگی کی اصل صورت حال کو واضح کرتے ہیں۔

سب سے پہلی صورت حال جو سامنے آتی ہے وہ تعلیم جیسے اہم شعبے سے اعتماد کا اٹھنا ہے یعنی اب علم کے اندر وہ قوت نہیں رہی کہ یہ اپنا حقیقی کردار ادا کر سکے جب کسی نظام میں اتنا اہم شعبہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے تو وہاں پر بیگانگی کا جنم لینا ایک واضح امر ہے۔"دارا" ، پروفیسر آرتھر سے ان الفاظ میں ہم کلام ہوتا ہے:

> "پروفیسر تمھارا تمام نظام تعلیم تمھاری طرح آخری دموں پر ہے۔" (۲)

اس طرح تعلیم جو کسی معاشرے کی روح ہوتی ہے اس سے اعتبار اٹھ جانا انسان کو ایک طرح کی روایت سے کٹ کر تنہائی کا شکار کر دیتا ہے تعلیم میں بنیادی طور پر اپنی تاریخی حیثیت بھی بیان کی جاتی ہے اور اس طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ "دارا" کا تعلیمی نظام کو آخری دموں پر دیکھنا گویا اس کے اس احساس کو اجاگر کرتا ہے کہ وہ خود کو اپنے تاریخی تناظر میں تنہا

محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ انسان تاریخی طور پر تنہا ہو گیا ہے۔اس تنہائی کا بڑا سبب جدید نظریات ہیں خاص کر علم نفسیات اور فرائیڈ نے انسان کو بہت بے بس دکھایا ہے۔فرائیڈ کے نظریہ نے انسان کو تنہا کرنے میں اہم کردار ادا کیا:

"کچھ سال پہلے دارا بے خوابی کا شکار تھا۔کافی دیر تک ادھر اُدھر کی کتابیں پڑھتا رہا
'پھر ایک دم اُس کی طبعیت اُکتا گئی۔اُس نے کتاب پلنگ سے نیچے پھینک دی، یہ نیو
فرائیڈین فراڈ ہے گھوم پھر کر وہی بات کہتے ہیں جو فرائیڈ نے کہی تھی، انسانی زندگی محض جنس تو نہیں"۔(۳)

"دارا" بار بار سوچتا ہے کہ ایک وقت میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ مذہب اور کلچر جیسی بڑی اقدار انسان کو زندہ رکھتی ہیں مگر اس پہ فرائیڈ نے وا کیا کہ انسان ایک جنسی حیوان ہے کتاب کو پلنگ سے نیچے پھینکنا گویا خود فراموشی کو اپنانا ہے اور حقائق سے منہ موڑنا ہے۔اس طرح انسان جو رشتوں کی محبت کو بہت اہمیت دیتا ہے جب اُس پہ یہ ادراک ہوتا ہے کہ تمام رشتے بس ایک حیاتیاتی تعلق ہیں اور محبت بھی ایک خود غرضانہ تجربہ ہے اور یہ جن رشتوں کو ہم اہمیت دیتے ہیں یہ دراصل فقط قربت کا نتیجہ ہوتا ہے اور انسان کے خون کے اندر کوئی ایسی کشش نہیں ہوتی جو اُسے رشتوں کی پاسداری پہ مجبور کرے تو اس کی بے قراری بڑھ جاتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

"خون کے رشتے محض ایک حیاتیاتی اتفاق ہوتے ہیں، اصل میں آپس کا بندھن ایک ہی چھت تلے پرورش پانے کی بدولت ہوتا ہے ایک دوسرے کی پیہم موجودگی سے ایک طرح کا اُنس اور یگانگت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے مثال کے طور پر میرا باپ سکندریہ میں ایک عورت سے شادی کر کے ایک عدد لڑکا پیدا کرتا ہے، وہ لڑکا تیس سالوں کے بعد مجھے ملتا ہے، خود ہی بتاؤ کہ اُس لڑکے کو دیکھ کر میرے اندر کوئی ایسا ردعمل پیدا نہیں ہو گا جو ظاہر کر سکے کہ ہم دونوں کی شریانوں میں ایک ہی خون بہہ رہا ہے"(۴)

جب یہ سارے خیالات اُسے بے قرار کرتے ہیں تو اُسے انسان تنہا نظر آتا ہے یہ فقط خیالات کی حد تک نہیں بلکہ ان تمام باتوں کا عملی تجربہ "دارا" کو اپنی زندگی میں ہو چکا ہے اپنے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کی صورت میں وہ دیکھ چکا ہے کہ مصیبت میں انسان کو تنہا بھی کھڑا ہونا پڑتا ہے۔اُس کا دوست اُسے اس تمام صورت حال سے نکلنے کا واحد ذریعہ دولت کا حصول بتاتا ہے، جس سے "دارا" کو کوئی خاص محبت نہیں ہوتی اور یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جس میں "دارا" دولت حاصل کرنے کا سوچتا ہے:

"دارا تم کاغذی شیر ہو جس کے ذہن میں چند بوسیدہ کتابوں کے ورک تبخیر معدہ کی وجہ سے الٹ پلٹ ہو رہے ہیں وہ نظریات جو تسلی دیتے ہیں وہ محض ایک فریب ہوتا ہے، ایک ایسا آئیڈیلزم جو احساس زیاں پر ختم ہوتا ہے، سوچو مت، عمل کرو اور لارڈ ہیملٹ بننے کی کوشش مت کرو، جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر مرو، جو کچھ بعد میں ہو گا دیکھا جائے گا، دولت کے ذریعے طاقت حاصل کرو۔"(۵)

طاقت اور دولت کا حصول بذات خود ایک ایسا امر ہے جو انسان کو مزید تنہا کرتا ہے اور اس کا سوچتے ہی "دارا" کو اپنے تمام آدرش یاد آتے ہیں کہ وہ تو ایمانداری، خلوص اور انسانیت کے بارے میں سوچتا تھا۔ یہاں پر وہ اپنے دوستوں کو کوستا ہے اور جس چیز میں انہیں پناہ ملتی ہے وہ شراب ہے شراب بھی ایک خود فراموشی اور اپنے آپ سے فرار ہے دارا اس تمام کرب کی آگاہی کو آرتھر سے یوں بیان کرتا ہے:

"ہم سب کا وژن ختم ہو چکا ہے، وہی راستہ ٹولو، دارا نے چیخ کر کہا۔
آرتھر اور وسکی پینے لگا تو دارا نے بوتل اُٹھالی۔" (۶)

پروفیسر آرتھر جو "دارا" کا دوست ہے وہ جہاں پر خود اس بیگانگی اور اجنبیت کا شکار ہے وہ اس اجنبیت پر تبصرہ بھی کرتا ہے آرتھر انسانی روّیوں میں تضاد کو دیکھتا ہے اور وہ یہی تضاد اپنی ذات میں بھی دیکھتا ہے اور اس تضاد کو ختم کرتے کرتے وہ خود کشی تک پہنچ جاتا ہے، وہ یہ تضاد مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں میں دیکھتا ہے اس تضاد کی کیفیت سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہر ایک اپنی اصل سے دور ہو چکا ہے مذہبی رہنما جو خود کو اپنے مذہب کی روح سے ملا ہوا ظاہر کرتے ہیں اُن کے بارے میں آرتھر کہتا ہے:

"یار عجیب تضاد ہے، بشپ پچاس روپے یہ تصدیق کرنے کے لئے لیتا ہے کہ میں عیسائی ہوں۔
اس سرٹیفیکٹ کے بعد مجھے پرمٹ ملتا ہے، دارا شرم آتی ہے۔ تمہارے مسلمان لمبی لمبی کاروں
میں بوڑھے، جوان عورتیں اور آدمیوں کو ہوٹلوں میں لاتے ہے۔ وہ باہر کاروں میں بیٹھے رہتے ہیں
اور یہ میلے اور پھٹے کپڑوں والے نشی سٹار ہوٹلوں کی بار سے وہسکی لاتے ہیں، عجب چکر ہے،
کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مذہب کہاں ختم ہوتا ہے اور تجارت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔"(۷)

اس طرح انیس ناگی کے تمام ناولوں میں ایک بیگانگی کی رو چلتی ہے ہر کردار یا تو سفر میں ہے اور اسے اپنے ارد گرد کے لوگ اجنبی لگتے ہیں یا پھر وہ معاشرے کا حصہ نہیں بن پا رہا۔ معاشرہ معاشرے سے اجنبی ہے اور ملک ملک سے اور یہ بیگانگی فرد کے اندر بھی ہے۔ بیگانگی میں جو اہم عنصر اُبھرتا ہے وہ ڈر کا عنصر ہے ایک بیگانہ انسان ہر طرف سے خود کو بے سہارا محسوس کرتا ہے چوہوں کی کہانی میں فرد کو اس خوف میں دکھایا گیا ہے یہ خوف فقط پڑوسی ملک سے وبائی چوہوں کا ہی نہیں بلکہ فطرت بھی انسان کی مخالف ہے اور ہر وقت تاک میں ہے وباء جو فطرت کی قوت ہے اس ناول میں خوف کی علامت بن کر ابھرتی ہے اور ایک بد اعتمادی کی فضا پورے ناول میں اجنبیت، خوف اور بیگانگی کی صورت آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے:

"اومائی گاڈ یہ جراثیم تو ہوا کے ذریعے ابھی ہمارے ملک میں آ سکتے ہیں۔ سمجھو تہ ایکسپریس میں
بھی چوہے سوار ہو سکتے ہیں لیکن یہ اندرون شہر آ کر کیا کریں گے؟ یونی خطرہ صرف ہمیں ہی
ہے۔ اندرون شہر کے ارد گرد تو نئے شہر کی آبادیوں کی جھالر لگی ہوئی ہے کہیں یہ نہ ہو کہ بیرونِ
شہر کے لوگ اندرون شہر کے لوگوں کو فصیلوں میں بند کر دیں۔ میں نے خطرے کا آلارم محسوس
کر لیا ہے بہتر یہی ہے کہ میں اپنے علاقے میں حفاظتی اقدام لینے شروع کر دوں۔"(۸)

شہر میں جب وباء کا خوف بڑھ جاتا ہے تو کسی کو کسی کی پرواہ نہیں رہتی ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے کوشاں نظر آتا ہے اور اس مصیبت کی گھڑی میں بھی لوگ ایک دوسرے پر الزام لگا کر انتقام کی آگ بجھاتے نظر آتے ہیں۔ مشترکہ کوشش جو کہ باہمی محبت کو ظاہر کرتی ہے اور اپنائیت کا احساس پیدا کرتی ہے اس کے لیے کوئی تیار نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی جان کی خیر مانگتا ہے اور اس طرح اس ناول میں فرقہ وارانہ فسادات دکھائے جاتے ہیں جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاشرہ کی کوئی بنیادی اکائی نہیں رہی بلکہ جو روح عصر ہے وہ تنہائی اور بکھراؤ ہے:

"پار وہمارے ملک میں سارا سال فرقہ وارانہ فسادات آخر کیوں؟ جس نے اس ملک میں رہنا قبول کر
لیا ہے اُس پر سیاسی الزام لگانا، چھرے گھونپنا، مسجدوں کو گرانا کہاں کی شرافت ہے؟ ہماری قوم کا دل

بہت چھوٹا ہے ہمیں انسان اور انسانیت کے لئے خیال کرنا چاہیئے۔ڈاکٹر شنکر کا خیال تھا کہ پاروتی اُس کی بات کو آگے بڑھائے گی لیکن اُس نے زور زور سے اونگھنا شروع کیا۔ ٹھہرو میں ابھی بات کا جواب دیتی ہوں رسوئی میں ہنڈیا جلنے لگی ہے۔وہ یہ کہ کر بھاگتی ہوئی اندر گئی۔ڈاکٹر شنکر کو پاروتی کی یہ حرکت بُری لگی لیکن وہ خاموش رہا۔وہ اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔اُسے پاروتی کے اولاد نہ ہونے کے دُکھ کا احساس بھی تھا۔شنکر کو علم تھا کہ پاروتی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں لیکن اُس نے ہمیشہ یہ بات کہی تھی۔"(۹)

ڈاکٹر شنکر اور پاروتی کے درمیان میاں بیوی کا تعلق ہے مگر پاروتی کی اولاد نہیں ہو رہی اولاد کی عدم موجودگی بھی میاں بیوی میں بیگانگی ہی کی علامت کے طور پر آتی ہے۔جب بیگانگی بڑھتی ہے تو انسان خود کو تنہا پاتا ہے اور پھر اس کا کوئی ملک نہیں ہوتا اور نہ ہی اُسے کسی ملک سے محبت ہوتی ہے ہجرت اس کا مقدر بن جاتی ہے چوہوں کی کہانی میں بھی کچھ اس طرح دیکھایا گیا ہے:

"اس خوف سے بچنے کے لیے میں نے اپنے شہر کے بارے میں سوچنا شروع کیا لیکن مجھے اپنے شہر میں ایسی کوئی پرکشش بات یاد نہ آئی جو میری توجہ کا مرکز بن سکتی۔میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح سے سفر کرتے سری لنکا پہنچ جاؤں گا اور وہ پل بھی دیکھ سکوں گا جو ہنومان نے سری لنکا اور اس ملک پر سمندر کے اوپر بنایا تھا۔لیکن وہ تو بندروں کا پُل تھا۔دفعہ کرو ان سب کو ، صبح ہوگی تو پھر دیکھیں گے۔صبح کے دو بج گئے تھے اور کرسی پر لیٹا نیند سے مغلوب تھا کہ مجھے کمرے کی پلائی ووڈ کے دروازے سے کسی چیز کے ٹکرانے کا شور سنائی دیا۔میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور جیب میں سے اپنا چھوٹا سا شکاری چاقو باہر نکالا۔ کمرے کے باہر پھر خاموشی چھا گئی اور مجھے اپنی بزدلی پر خفت ہوئی۔" (۱۰)

کیمپ ناول میں بھی میجر قربان کو تنہائی کے کرب میں مبتلا دکھایا گیا ہے اُس کی بیوی کی وفات کے بعد اُس کی زندگی اور بھی تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے دوسری طرف وہ جن مہاجر کیمپ میں تعینات ہے وہیں پر جہاں مہاجر اپنے ملک اپنے شہر سے دور ایک کیمپ میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں وہیں پر میجر قربان اتنے لوگوں میں بیگانگی کا شکار ہے کیونکہ نہ تو وہ اُن کے کلچر سے واقف ہے اور نہ زبان سے ناول کی فضا بندی ایسی کی گئی۔ہے کہ تمام مناظر مل کر ایک ایسی صورت پیدا کرتے ہیں جس میں ایک اداس اور تنہائی کا احساس بڑھتا ہے۔ناول کے شروع میں یہ فضا اس طرح دکھائی جاتی ہے:

"آدھی رات کا سماں ہر سمت ہو کا عالم اتنی کھلی فضا میں ،اتنی وسعت میں مکمل سکوت ہے کسی چرند یا پرند یا کیڑے مکوڑے کی کوئی آواز یا شور سنائی نہیں دیتا۔اس وادی میں ہوا کا سفر ہے۔مٹی کے خستہ مکانوں میں کہیں کہیں لیمپوں یا لالٹینوں کی مدہم روشنی دیکھائی دیتی ہے۔یہاں جو مہاجرین آباد ہیں وہ کافی منظم ہیں اُن کے رہنے پر یہاں بجلی فراہم کی گئی ہے اور وہ سارے مل کر بڑی باقاعدگی سے بجلی کا بل ادا کرتے ہیں۔یہ علاقہ پُر رونق دنیا سے بہت دور ہے بلکہ ایک اعتبار سے کٹا ہوا ہے۔"(۱۱)

افغان مہاجر جو کیمپ میں رہتے ہیں اگر چہ اہل علاقہ اُن کے ہم مذہب ہیں مگر سب یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ملک سے چلے جائیں کیونکہ سب کو ایک ہی خوف ہے کہ وہ کہیں ان کو معاشی طور پر تباہ نہ کر دیں معیشت ایک ایسی چیز ہے جو ناول نگار دکھاتا ہے کہ یہ ہر مذہب سے بڑی قوت ہے "ملک صاحب" کا میجر قربان سے ہونے والا یہ مکالمہ ظاہر کرتا ہے کہ مہاجرین کے بارے میں لوگ کس قسم کے خیالات رکھتے تھے:

> "میجر صاحب ان مہاجروں کا کچھ کریں یہ ہمارے علاقوں میں گھس آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہمارا کاروبار بھی سنبھالنے لگے ہیں میں نے اوپر ایک دو مرتبہ بات بھی کی ہے لیکن سب نے مجبوری کا اظہار کیا ہے بلکہ یہ کہا کہ باہر سے امداد آتی ہے۔ اس سے ہمارا کام بھی چلتا ہے اور لوگوں کو ملازمتیں بھی مل جاتی ہیں یہ لوگ خود بخو کیسے چلے جائیں گے؟ میجر صاحب یہ بھی کبھی ہوا ہے جب مصر میں بنی اسرائیل کاروبار کر کے خوش حال ہو گئے تو اُنھیں وہاں سے نکالنا ناممکن تھا۔" (۱۲)

ناول نگار اکثر ناولوں میں جہاں فرد کی بیگانگی کو موضوع بناتا ہے وہیں پر یہ قوموں کی بیگانگی کو بھی سامنے لاتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان صدیوں کی مشترک اقدار اور کلچر کے باوجود کس طرح طاقت اور وسائل پر قبضے کے لالچ نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے دور کیا اور کیسے دونوں ممالک ایک دوسرے کے خون کے در پے ہیں بہت سے ناولوں میں اس کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ عالمی قوانین اور اخلاقی ضوابط کی موت کو دکھایا گیا ہے ناول نگار کے نزدیک کوئی بھی اخلاقی ضابطہ کار گر نہیں رہا فقط طاقت کار گر ہے۔ "کیمپ" میں جب میجر قربان ہندوستانی آفیسر شام سنگھ کو جنیوا کنوینشن کے حوالے سے بات کرتا ہے:

> میجر قربان تلملا کر اپنی کرسی سے اُٹھا، شام سنگھ نے اس کے کاندھے پر زور سے بید مار کر اسے بیٹھے کے لئے کہا۔ اس سکھ نے اس کے ساتھ کسی مروت کا اظہار نہ کیا اگلے دن میجر قربان کی طبعیت سست تھی دو فوجی اسے پکڑ کر کیمپ میں بنی ہوئی ڈسپنسری کی طرف لے گئے۔ سارے جنگی قیدی اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں میں ملبوس بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میجر قربان کو ڈسپنسری کی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا اور وہ دونوں فوجی غائب ہو گئے۔ شام ہو چلی تھی۔" (۱۳)

ناول کے آخر میں ناول نگار انسانی فطرت پر تبصرہ کرتا ہے کہ انسان کے اندر خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اسے کوئی مذہب کوئی ضابطہ نہیں سدھار سکتا۔ اس ہماری صورت حال کے بعد جو موجودہ صنعتی دور میں مزید بڑھ گئی ہے اور اس سے فرد کے اندر جس نفسیاتی دباؤ کو جنم دیا ہے اس کا منہ بولتا ثبوت میجر قربان ہے جو اس بیگانگی کی فضا سے تنگ آکر آخر میں خود کشی پر مجبور ہوتا ہے۔ ناول کا یہ پیرا گراف ملاحظہ ہو:

> "اس لیے کے انسان بے اعتبار ہے، اس لئے کہ انسان بے رحم ہے۔ اُس کے دل کی سفاکی کو کوئی فلسفہ، کوئی مذہب ختم نہیں کر سکا۔ اگر یہ درست ہے تو کیا پھر زندہ رہنا واقعی ضروری ہے؟ مجھے اس بات کا بہت دیر کے بعد خیال آیا ہے۔ میجر قربان نے اپنے کوٹ کے کالر اونچے کئے کیونکہ دریا کی ہوا میں خنکی آچکی تھی وہ ٹیرس پر رکھے ہوئے بید کے ایک بینچ پر بیٹھ کر دریا کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں اس کے گارڈ نے اطلاع

دی کہ لاہور سے تین لوگ اسے ملنے آئے ہیں اور ایک لمبی سی کار میں بیٹھتے ہیں میجر نے ایک دم اپنی کلا شنکوف اُٹھا کر اس کا میگزین چڑھالیا۔"(۱۴)

اگر چہ انیس ناگی کے ناولوں میں بیگانگی کے عناصر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں یہ بیگا نگی جہاں کرداروں کے سفر سے ابھرتی ہے وہیں پر تمام کردار اپنی اصل سے ہٹ کر بھی ایک بیگانگی کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔"زوال" کا احسن جو کہ ایک اُستاد ہے اُس کو بھی اسی بیگانگی کا سامنا ہے جب وہ اسلام آباد میں ایک کا نفرنس میں شرکت کے لیے جاتا ہے تو وہاں پر جہاں اُسے تمام غیر ملکی چہرے نظر آتے ہیں وہیں پر اُسے اپنے ملک کے لوگوں میں بھی صوبائی سطح پہ بیگانیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔احسن مختلف مصیبتوں کا شکار ہو کر اپنی ذات سے دور ہوتا چلا جاتا ہے سلیم الرحمن نے "زوال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سطحی طور پر (زوال کے) ہیرو کی فرانز کافکا کی کہانی "کایا کلپ" کے کردار سے مماثلت ہے جو اپنے طور پر علالت اور بربادی کے ایک مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہر کیف کافکا کے چھوٹے سے ناول میں فضا علامتوں سے بوجھل ہے اس کے برعکس انیس ناگی نے اپنے سراسر حقیقت پسندانہ رویے سے انحراف نہیں کیا ہے۔"(۱۵)

اسی طرح "ایک لمحہ سوچ" کا میں رحمٰن کی کیفیت دکھائی گئی ہے جو نسٹلجیائی صورت حال کا شکار ہے اور ماضی سے کٹا ہے اور وہ بات بات پر خود کو ماضی کے حوالے دیتا ہے یہ زمانہ حال سے بیگانہ شخص ہے اس دوران میں مغلوں کے زوال کے اسباب کے متعلق وہ بات کرتا ہے اور تمام مسلمان قوم کو ۱۸۵۷ء کے تناظر میں ایک بیگانگی کی کیفیت میں دکھایا گیا ہے انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی کی صورتحال دکھائی جاتی ہے اور بہادر شاہ ظفر کے زوال کو بیان کیا جاتا ہے کیا اس تمام دور کے ختم ہونے پر ایک پوری قوم بیگانگی کا شکار ہوئی تہذیبی اور ثقافتی پس منظر تبدیل ہو جانے سے جو صورتِ حال جنم لیتی ہے اس کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔بیگانگی کی ایک اور صورت اگر کرداروں کے ذاتی عمل کے حوالے سے دیکھیں تو قلعہ میں موجودہ تمام اہل کاروں کو رشوت لیتے زنا کرتے اور دوسری برائیوں میں مبتلا دکھایا گیا ہے جو کہ مذہب کی دوری سے پیدا ہونے والی بیگانگی کی ہی ایک صورت ہے اس طرح "میں اور وہ" کا مرکزی کردار جسے عرب ممالک میں روزی کے سلسلے میں ایک بیگانگی کی صورتحال میں دکھایا گیا ہے۔وہاں پر جہاں اس ملک کے لوگ ان کو باہر سے آنے والے سمجھتے ہیں اس حالت میں جب اس کے پاس واپسی کا بھی کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔اس ساری صورتحال کے بارے میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"میں کسی لغو سوچ میں کھو گیا ہوں، ماضی؟ یہ مجھے کیا دے سکتا ہے؟ اس طرح تو مستقبل بھی لغو ہے کہیں بھی روشنی کی کوئی کرن نہیں ایک مایوسی ہے۔اعتماد کی کمی ہے ہر ایک سے خوف آتا ہے، حال نے کون سی مشکل آسان کر دی ہے کہ زمانوں کا گلہ کروں ہر زمانہ مجھے وقت کے درمیان چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور وقت کے لمحات گنتے گنتے زندگی میں کچھ کیے بغیر، عمر کی اس دہلیز پر محو سوچ ہوں جس کے آگے زوال، بیماری اور خوف ہے۔"(۱۶)

ایک گرم موسم کی کہانی میں بھی جاوید جو کہ اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور صوبے دار بہادر علی اور جسونت سنگھ ایک معرکہ خیز زندگی کے بعد ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں اور اس قتل کے پیچھے بھی بنیادی محرک وہ خلا ہے جو ان کرداروں کی ذات میں پیدا ہوتا ہے۔انیس ناگی نے بھی جدید آدمی کے اُس کرب ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے جس کی بدولت آج کا انسان خود سے لا تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گردو پیش سے بھی بیگانہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، محمد سلیم الرحمٰن، (مولفین)، منتخب ادبی اصطلاحات۔لاہور: شعبۂ اردو جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔ص ۱۷

۲۔انیس ناگی، قلعہ، مشمولہ، فصیلیں، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء۔ص ۲۷

۳۔ایضاً۔ص ۳۸

۴۔ایضاً۔ص ۴۲

۸۔ایضاً۔ص ۲۹

۶۔ایضاً۔ص ۱۲۱

۷۔ایضاً۔ص ۲۰۲

۸۔انیس ناگی، چوہوں کی کہانی، مشمولہ، فصیلیں، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء۔ص ۲۲۷

۹۔ایضاً۔ص ۲۸۲

۱۰۔ایضاً۔ص ۲۶۵

۱۱۔انیس ناگی۔کیمپ، مشمولہ، فصیلیں، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۵ء۔ص ۳۲۷

۱۲۔ایضاً۔ص ۳۵۳

۱۳۔ایضاً۔ص ۳۸۵

۱۴۔ایضاً۔ص ۳۸۸

۱۵۔ سلیم شہزاد، تنویر ساغر، (مرتبین)، نئے ادب کا معمار، لاہور: حسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔ص ۱۰

۱۶۔انیس ناگی۔میں اور وہ۔لاہور: فیروز سنز۔۹۸۳ اء۔ص ۱۶